علامہ طالب جوہری

(سیرت و کردار)

عامر حسینی

وسعت اللہ خان

مبشر علی زیدی

سید عدنان کریمی

حاشر بن ارشاد

انعام رانا

نوید صادق

فہرست

علامہ طالب جوہری اور علمی روایت

عامر حسینی

23 جون، 2020ء

علامہ طالب جوہری 21 جون 2020 اتوار کو کراچی میں حرکت قلب بند ہونے سے انتقال کر گئے۔ ان کے انتقال سے برصغیر پاک و ہند میں کلاسیکل اردو مجلس خوانی اور شیعی سماجی علمی روایت کا روشن باب بند ہو گیا۔

علامہ طالب جوہری 27 اگست 1939ء کو تقسیم سے قبل بہار کے شہر پٹنہ میں پیدا ہوئے اور ابتدائی تعلیم وہیں سے حاصل کی۔ ان کے والد مولانا محمد مصطفٰی جوہر بذات خود بہت بڑے عالم دین تھے۔ علامہ طالب جوہری کے دادا حکیم محمد مسلم پیشہ کے اعتبار سے طبیب تھے اور حکمت خانہ چلایا کرتے تھے۔ علامہ طالب جوہری کے والد 1895ء میں بہار کے قصبے بھاگل پور میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم بھاگلپور کے انگریزی میڈیم اسکول میں حاصل کی تھی اور پھر سلطان المدارس لکھنؤ پڑھنے کے لیے بھیج دیے گئے تھے، جہاں سے انھوں نے علوم عقلیہ و نقلیہ پر عبور حاصل کیا۔ 1923ء میں

معروف شیعہ عالم مولانا محمد باقر نے پٹنہ بہار میں مدرسہ عباسیہ کے نام سے بڑے مدرسے کی بنیاد رکھی، جس میں دینی و دنیوی علوم دونوں پڑھائے جاتے تھے۔ مولانا محمد باقر نے مولانا محمد مصطفی جوہر کو مدرسے کا نائب پرنسپل/نائب مدرس اعلی مقرر کر دیا۔ اس طرح سے علامہ طالب جوہری کا خاندان ان کی پیدائش سے پہلے بھاگل پور سے پٹنہ بہار منتقل ہو گیا۔ مولانا محمد مصطفی جوہر کو جہاں شیعہ مذہب کے اصول و فروع پر عبور تھا۔ وہیں انہیں انگریزی ادب پر بھی کافی دسترس حاصل رہی، وہ مجالس عزا سے بھی خطاب کیا کرتے تھے۔ انہوں نے چند کتابیں بھی شیعہ اصول و فروع پر لکھیں، انہیں فلسفہ، منطق اور حکمت میں بھی خصوصی شغف تھا۔ علامہ محمد مصطفی جوہر تقسیم ہند کے بعد 1951-54 کے درمیانی عرصے میں پاکستان کے شہر کراچی آکر بس گئے۔ اس وقت علامہ طالب جوہری کی عمر تیرہ سے چودہ سال کے درمیان ہو گی۔

کراچی میں آباد ہو جانے کے بعد علامہ طالب جوہری سرکاری اسکول میں داخل ہوئے اور ابتدائی تعلیم مکمل کی۔ شواہد و آثار یہ بتاتے ہیں کہ علامہ طالب جوہری 60ء کی دہائی میں عراق میں آیت العظمی السید محمد خوئی کے نجف

اشرف میں واقع مدرسے میں پڑھنے گئے۔ وہاں ان کے اساتذہ میں سب سے نمایاں آیت اللہ سیستانی اور آیت اللہ باقر الصدر تھے۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ علامہ طالب جوہری اور ان کے والد علامہ محمد مصطفی جوہر نے اپنے آپ کو براہ راست سیاست میں ملوث کرنے سے گریز کا جو راستہ پنایا وہ راستہ خود آیت اللہ خوئی کا تھا، انہوں نے آیت اللہ باقر الصدر کا راستہ نہیں اپنایا۔

علامہ طالب جوہری نے اپنے والد کی حیات میں 70ء کے آخری عشرے میں مجالس خوانی شروع کردی تھی۔ کراچی میں مجالس خوانی میں ان دنوں علامہ رشید ترابی اور پھر علامہ عقیل ترابی کا توتی بولتا تھا۔ کراچی سمیت پورے سندھ اور ایسے ہی پنجاب میں جو امام بار گاہیں اردو بولنے والے سادات کے زیر انتظام تھیں، ان امام بار گاہوں میں لکھنؤ سے سید دیدار علی عرف غفران مآب کے دور سے عروج پکڑنے والی مجلس خوانی کا ڈسکورس ہی غالب تھا۔ مجلس کا آغاز تقریر سے ہوتا جو چار اجزا پر مشتمل ہوتی۔ پہلے توحید، پھر رسالت پھر اہل بیت اطہار اور اس کے بعد مصائب پڑھے جاتے۔ آج تک اردو بولنے والوں کی امام بار گاہوں میں یہی طریقہ کار چلا آرہا ہے۔ علامہ طالب جوہری کے والد شیعہ مذہب کے اصولی مکتب فکر سے تعلق رکھتے تھے۔ جسے ریاست اودھ اور ایسے

ہی بہار میں لکھنؤ کے مولانا دیدار علی غفران مآب نے فروغ دیا تھا جو عراق جانے سے پہلے اخباری شیعہ تھے اور برصغیر میں عامۃ الناس میں یہی اخباری شیعت ہی جاری وساری تھی۔

مجلس خوانی میں بھی شعر خوانی غالب ہوا کرتی تھی علامہ طالب جوہری بھی اسی روایت کے پیرو تھے۔ علامہ طالب جوہری سے پہلے کراچی کے آسمان پر علامہ رشید ترابی کی مجلس خوانی کا شہرہ تھا۔ شام غریباں کی مجلس جو وہ پڑھا کرتے وہ پاکستان ٹیلی ویژن پر براہ راست نشر ہوا کرتی تھیں۔ پھر ان کے بعد علامہ طالب جوہری کی مجلس خوانی کی دھاک عوام الناس کے دلوں پر بیٹھنا شروع ہوئی۔ علامہ طالب جوہری مجلس عزا میں قرآن پاک کی عقلی و منطقی اعتبار سے ایسی تشریح فرماتے کہ مجمع عش عش کر اٹھتا۔ وہ آغاز میں نکات توحید قرآن کی روشنی میں بیان کرتے پھر عقیدہ رسالت کو عقلی و نقلی دلائل سے سامنے لے کر آتے۔ پھر قرآن اور پیغمبر اکرم ﷺ سے اہل بیت اطہار کے تعلق و رشتے اور اللہ کے ہاں ان کے مقام کی وضاحت کرتے۔ آخر میں کربلا والوں کے مصائب پڑھتے اور مجمع کی ہچکیاں بندھ جایا کرتیں۔

میں اور میرا ایک دوست عمیر عبداللہ جب کبھی چھٹیوں میں واپس گھر نہ جاتے اور عاشورہ کراچی میں منانے کا فیصلہ کرتے تو ہم دونوں باقاعدگی سے انچولی سوسائٹی کراچی کی امام بارگاہ جاتے جہاں دس دن کے لیے علامہ طالب جوہری خطاب فرماتے۔ میں اگر صوفی سنّی گھرانے کا نوجوان تھا تو عمیر عبداللہ دیوبندی سنّی گھرآنے سے تعلق رکھتا تھا۔ ہمیں طالب جوہری کی خطابت کا نشہ سا ہو گیا تھا۔ طالب جوہری کی تقریر میں اشاروں اور کنایوں میں نزاعات مابین شیعہ و اہلسنت بات ہوا کرتی تھی وہ لطیف پیرائے میں قرآنی آیات، احادیث اور عقلی و منطقی دلائل اپنے مسلک کے حق میں بیان کرتے تھے۔ جب وہ ایسا کرتے تو ہم ایک دوسرے کی طرف دیکھتے اور دبی دبی ہنسی کے ساتھ دماغ سے علامہ جوہری کی بات کو نکال دیا کرتے۔

بلاشبہ علامہ طالب جوہری کی مجالس نہ صرف شیعہ میں مقبول تھیں بلکہ ہمارے جیسے اہلسنت کے کثیر افراد ان کی مجالس سننے آیا کرتے۔ علامہ کسی موقع پہ بھی شیعہ سنی تنازعہ پیدا کرنے کی کوشش نہیں کرتے لیکن اس کا یہ بھی مطلب نہیں تھا کہ وہ اتحاد و اتفاق کے نام پر اپنی شیعی شناخت اور اس کی

پہچان نظریات بیان کرنے سے پیچھے ہٹتے تھے۔یہی صلح کلیت کا جوہر ہے کہ اپنا مسلک چھوڑیں نہیں دوسروں کا مسلک چھیڑیں نہیں۔

علامہ طالب جوہری نے واقعات کربلا کے بارے میں ایک کتاب ''حدیثِ کربلا'' کے نام سے قلمبند کی جو اردو زباں میں لکھے گئے کربلا ناموں میں سب سے بڑی اور مقبول کتاب ہے۔اس کے علاوہ انہوں نے قرآن پاک کی اردو میں تفسیر بھی لکھی جو کافی مقبول ہوئی۔ ان کی شاعری کی تین کتابیں ''حرفِ نمو''، ''پسِ افق''اور ''شاخِ صدا'' شائع ہوئیں۔ان کا کلام معروف ادبی جریدوں (فنون،ادب لطیف، مکالمہ)وغیرہ میں شائع ہوتا رہا۔

علامہ طالب جوہری 80 سال کی عمر میں کراچی میں رحلت فرما گئے۔ ان کی پھیلائی ہوئی افکار کی روشنی ان کی ہمیشہ یاد دلاتی رہے گی۔

بغیر منبر والے طالب جوہری!

وسعت اللہ خان

24جون،2020ء

اکتوبر 1991، شمالی لندن۔ بی بی سی کی نوکری اختیار کیے پانچ ماہ گزر گئے۔ اس دوران میرا صرف ایک گھر میں آنا جانا کھانا پینا تھا۔ جعفر بھائی اور فیروزہ جعفر عرف بجیا کا گھر۔

جعفر بھائی نے ایک دن پوچھا ارے کراچی میں ہمارے ایک بھتیجے بھی رہتے ہیں طالبِ جوہری، کبھی ان سے ملاقات ہوئی؟ میں اچھل پڑا۔ آپ کے بھتیجے ہیں علامہ؟ ہاں تو کیا ہوا، کیا علامہ لوگ کسی کے بھانجے بھتیجے نہیں ہو سکتے؟

اور پھر لگ بھگ ایک ماہ بعد بجیا نے فون کیا وہ آ گئے ہیں تمہارے علامہ، ملنا ہے تو آ جاؤ۔ ہم بجیا کے گھر سے پانچ منٹ کی پیدل دوری پر ایک سٹوڈیو فلیٹ میں رہتے تھے۔ یہ تصور ہی کتنا زبردست تھا کہ جس شخص کو کبھی کبھار عشرے کی مجالس میں ہزاروں کے مجمع میں بیٹھ کر سنا اان سے آج بالمشافہ ملاقات ہو گی۔

علامہ سفید کرتے پاجامے میں صوفے پر ایک ٹانگ رکھے اور دوسری لٹکائے بیٹھے تھے۔ تپائی پر ڈن ہل کا پیکٹ اور ایش ٹرے اور قہوے کا کپ۔ میں برابر بیٹھنے کے بجائے احتراماً نیچے بیٹھ گیا۔ بولے 'میاں یہ کیا۔ یہ ڈرامے بازی مت کرو۔ تمہاری بجیا نے تمہارے بارے میں ہمیں پہلے ہی سے بتا دیا ہے۔ اوپر بیٹھو۔'

لگ بھگ 15 دن علامہ بجیا کے گھر رہے۔ دونوں کے درمیان خوب نوک جھونک ہوتی تھی اور آخر میں علامہ کہتے پھوپھو ہم تم سے نہیں جیت سکتے مگر ہمارا منہ بند کروانا ہے تو کچھ میٹھا کھلواؤ۔ چنانچہ کبھی کھجور، کبھی انبالے کی مٹھائی، کبھی کھیر کبھی کچھ حتیٰ کہ رات دو بجے بھی گفتگو کرتے کرتے نعرہ بلند کر دیتے ارے کوئی ہے جو عاشقِ چہاردہ معصومین کو میٹھا پیش کرے۔

دوسرا یا تیسرا دن ہو گا جب ہم حاضری بھرے بیٹھے تھے۔ کہنے لگے میاں دنیا کے ہی ہو یا دین وین سے بھی کچھ دلچسپی ہے۔ میں نے بتایا کہ قران کا پہلا اور 30 واں پارہ پڑھا ہے۔ سکولی اور غیر نصابی کتابوں میں واجبی سی اسلامی تاریخ

پڑھی ہے، بس۔ کہنے لگے اچھی بات ہے کہ تم نے اسلامی تاریخ واجبی سی پڑھی ہے، زیادہ گہرائی سے پڑھتے تو خاموش ہو جاتے یا پھر کج بحث۔

سن اسّی کے عشرے میں پی ٹی وی سے فہم القران کی طویل سیریز نشر ہوئی جس میں علامہ نہایت عام فہم اور زود ہضم انداز میں پیغامِ قران سمجھاتے تھے۔ اس سیریز کے چند پروگرام میں نے بھی دیکھ رکھے تھے۔ چنانچہ جب علامہ لندن آئے تو میں نے کہا کہ جب تک آپ یہاں ہیں میں چاہتا ہوں کہ کم از کم سورۃِ فاتحہ سمجھنے میں میری مدد کریں۔ علامہ نے فوراً کہا جب چاہو جتنا چاہو۔

اس کے بعد نو دس دن تک علامہ روزانہ کوئی ایک موضوع لے لیتے جیسے الحمد، رب العالمین، یوم الدین، نستعین وغیرہ۔ اور آدھا پونا گھنٹہ پرت در پرت سببِ نزول، ماخذ، تاریخی پس منظر اور منطق کے سہارے ایسے لے کر چلتے گویا بچے کو کہانی سنا رہے ہوں۔

شاید یہ عراق میں لگ بھگ ابتدائی دس برس حضرت قاسم الخوئی، باقر الصدر اور دیگر علمائے عظام کے آگے زانو تہہ کرنے، عربی و فارسی پر عمومی دسترس اور عرب و عجم کی تاریخ فہمی کا فیض تھا کہ علامہ کی مذہبی و غیر مذہبی گفتگو ادق

مسائل کا احاطہ ضرور کرتی تھی مگر ان کی اجتہادیت مشکل پسندی اور علمیت کے مصنوعی دبدبے سے بالکل آزاد تھی۔اسی لیے عام آدمی بھی بلاامتیازِ مسلک و نظریہ بلادھڑک ان کی جانب کھنچتا تھااور پورا پورا ابلاغی لطف کشید کرتا تھا۔

پھر علامہ پاکستان لوٹ گئے اور پھر لگ بھگ پندرہ سولہ برس بعد ان سے انچولی کے گھر پر ملاقات ہوئی۔ میں نے فون کیا تو اتفاق سے علامہ نے ہی اٹھایا۔ جیسے ہی کہاالسلام وعلیکم،دوسری جانب سے وعلیکم السلام کے بجائے آواز آئی 'لندن سے بات کر رہے ہو بدمعاش یا کراچی میں ہو'۔ میں علامہ کی اس غیر معمولی یادداشت و سماعت پر ششدر رہ گیا۔ پندرہ سولہ برس پہلے محض چند دن کی ملاقاتوں کے باوجود ہزاروں آوازوں میں سے کسی ایک آواز کو پہچان لینا۔اف یہ آدمی ہے یا جن؟

اس کے بعد ہر پانچ چھ ماہ بعد حاضری ہو جاتی۔ نیچے عشا کے بعد سے فجر تک کھلی کچہری جس میں ہر طرح کے موضوع سے لدا پھندا شخص ہر طرح کی کھانے پینے کی اشیالا رہا ہے۔اس کچہری میں دو طرفہ گفتگو کی زیادہ گنجائش نہیں ہوتی

تھی۔ علامہ دوسری، تیسری حاضری میں میری بے چارگی بھانپ گئے اور انھوں نے محمد علی سید سے کہا آئندہ عصر تا مغرب ملاقات طے کرتے ہیں۔

اس کا فائدہ یہ ہوا کہ علامہ کے گھر کی اوپر والی منزل میں قائم لائبریری میں ہر چند ماہ بعد گھنٹہ، 45 منٹ کی ملاقات ہو جاتی۔ لائبریری کی ہزاروں کتابوں میں سے ہر کتاب علامہ کی انگلیاں پہچانتی تھیں چنانچہ انھیں کسی بھی ریفرینس کے لیے کوئی بھی کتاب نکالنے میں زیادہ سے زیادہ دو منٹ لگتے تھے۔بقول محمد علی سید علامہ نے بلاشبہ ہزاروں مجالس پڑھیں مگر ہر مجلس کی تیاری وہ ایسے انہماک اور محنت سے کرتے گویا سپریم کورٹ میں آخری پیشی ہو۔

لائبریری میں علامہ خود کو بیرونی دنیا سے محفوظ سمجھتے تھے۔انہیں طرح طرح کے قہوے اور کھجوریں کھانے اور کھلانے کا شوق تھا۔ ہر طرح کے قہوے اور کھجور کی تاریخ بھی ساتھ ساتھ بتاتے جاتے۔ کہتے تھے میرا بس چلے تو کھجوروں اور قہوے کی اقسام کا ایک پورا عجائب گھر بناؤں۔

علامہ چونکہ اکثر مداحوں میں گھرے رہتے تھے لہٰذا کبھی کبھار وہ ان معمولات کو توڑ کر لانگ ڈرائیو یا پرندوں کے مشاہدے کے لیے نکل کھڑے ہوتے۔

کسی بھی دور دراز سڑک سے ہٹے ہوئے چارپائی ہوٹل پر بیٹھ کر بہت خوش ہوتے جہاں انھیں کوئی پہچاننے والا نہ ہو۔

رفتہ رفتہ علامہ کی فراخدلی جراتِ سوال کی عادت بڑھاتی چلی گئی۔ایک بار میں نے اچانک پوچھ لیا کہ علامہ میں نے آپ کی بہت زیادہ مجالس تو نہیں سنیں البتہ جتنی بھی سنی ہیں وہ تبرے سے پاک ہوتی ہیں۔فرمایا 'جب باورچی کام میں کچا ہو تو اسے اپنی فنی خامیاں چھپانے کے لیے مصالحہ تیز رکھنا پڑتا ہے۔میری تو یہی سمجھ میں نہیں آتا کہ جو موضوع شروع کیا ہے وہ سمیٹوں کیسے لہٰذا دھیان کبھی خواہ مخواہ کی باتوں کی جانب پھٹکتا بھی نہیں۔امید ہے آپ کی تشفی ہو گئی ہو گی'۔

سیاست پر بہت کم یا تمثیلی انداز میں گفتگو کرتے تھے۔ایک بار ایران سے ہو کر آئے اور طلب فرمالیا۔تفصیل سے سفر کا احوال بتاتے رہے۔میں نے درمیان میں پوچھا کہ آج کل وہاں کرپشن کے خلاف مظاہرے ہو رہے ہیں، آپ کا کیا تاثر ہے۔کہنے لگے کہ 'اس بار جب میں تہران سے قم جا رہا تھا تو ٹیکسی والا میرا جبہ عمامہ دیکھ کر خاصا چپ چپ رہا مگر جب میں نے اس کی روزمرہ زندگی

کریدنی شروع کی تو کھلتا چلا گیا۔ کہنے لگا آغا یہ بتائیے کہ آپ نے جو جبہ پہنا ہے اس میں کتنی جیبیں ہیں، میں نے کہا دو۔ کہنے لگا آغا یہاں تو ہر جبے میں جیبیں ہی جیبیں ہیں اور بھرتی ہی نہیں۔اب تم ڈرائیور کے اس قصے سے جو چاہے اپنا صحافیانہ مطلب نکال لو۔'

علامہ علومِ قرانی پر تو ملکہ رکھتے ہی تھے مگر نہ خود زاہدِ خشک تھے نہ زاہدانِ خشک کی ہمراہی میں خوش رہتے تھے۔ان کی شرارت آمیز خوش دلی اور حسِ جمالیات ہمیشہ توانا و تر و تازہ رہی۔ بطور گواہی تین شعری مجموعے حرفِ نمو، پسِ آفاق اور شاخِ صدا بھی پسماندگان میں چھوڑے۔

اول اول علم فقط اک نقطہ تھا

آخر آخر جہل بنا تاویلوں سے

جسم کی خیمہ گاہ میں کتنے ہم زادوں کا ڈیرہ تھا

ایک اکیلی روح کہاں تک ان میں بسر اوقات کرے

وحشتِ دل پر صبر کا نسخہ سب نے ہی تجویز کیا

جب پڑھا تو نسخہ لکھنے والے ہی بیمار ملے

کم ہی لوگ واقف ہیں کہ علامہ صنعتِ اہمال یعنی لایعنی شاعری میں بھی یدِ طولی رکھتے تھے اور سخنوروں کو چیلنج کرتے تھے کہ کوئی ایسا مصرعہ لکھ کے لاؤ جس کا کوئی مطلب نہ ہو۔ اس صنف میں علامہ نے بیسیوں اشعار کہے جن کا ریکارڈ جانے کس کے پاس ہوگا البتہ بطور نمونہ صنعتِ اہمال میں دو شعر حاضر ہیں۔

کھڑکی سے بھاگتی تھی دلہن حادثات کی

گھوڑا لیے کھڑا تھا پتیلی حیات کی

جب مرغ آگہی نے پپیتے میں سر دیا

نیولے کو میں نے مژدہِ رنگ سفر دیا

ایک دفعہ بہت ہی شگفتہ موڈ میں کہنے لگے میاں تم اتنے باصلاحیت ذہین آدمی ہو، شیعہ کیوں نہیں ہو جاتے۔ میرے منہ سے بے ساختہ نکل گیا اعلیٰ حضرت میں تو کب کا شیعہ ہو جاؤں مگر علامہ ضمیر اختر نقوی (لڈن جعفری) کو دیکھ کر سوچتا ہوں کہ سنی رہنے میں کیا برائی ہے۔ اس پر علامہ نے مسکراتے ہوئے کہا 'بہت بد معاش ہو تم بہت ہی زیادہ۔'

علامہ 81 برس کی عمر میں چلے تو گئے بس یہ شکایت ہے کہ قحط الرجال کے لق و دق بیابان میں پہلے ہی کتنے شجرِ سایہ دار بچ گئے تھے جو ایک اور کم پڑ گیا۔ ایسے بڑے آدمی کا ذیابیطس، دل کے عارضے وغیرہ کے ساتھ اوپر جانا اچھا نہیں لگتا۔

کیا کہا؟ ان کا خلا ایک طویل عرصے تک پر نہیں ہو سکے گا۔ مجھے تو شک ہے وہ خلا بھی اپنے ساتھ ہی لے گئے۔

علم کا طالب، کتابوں کا جوہری

مبشر علی زیدی

23 جون، 2020ء

ٹیلی وژن اور صحافت میں طویل عرصہ کام کرنے کی وجہ سے میں بتا سکتا ہوں کہ بہت سے لوگ آن اسکرین کچھ اور ہوتے ہیں اور آف اسکرین کچھ اور۔ عوامی زندگی میں کچھ اور، ذاتی زندگی میں کچھ اور۔ منبر پر کچھ تو نجی محفل میں کچھ اور۔

علامہ طالب جوہری کی شخصیت کے کئی پہلو ہیں لیکن کسی رُخ میں تصنّع نہیں تھا۔ جیسی گفتگو مجلس کے خطاب میں کرتے تھے، ویسی ہی ٹیلی وژن کی تقریر میں۔ جو مؤقف عوام کے سامنے ہوتا تھا، وہی حکام کے سامنے۔ جس انداز سے علما سے مخاطب ہوتے تھے، اسی طرح مجھ جیسے طالب علم کے سامنے۔

علامہ صاحب کا روپ ایک ہی تھا لیکن میں نے انھیں مختلف زمانوں میں مختلف نگاہوں سے دیکھا۔ ایک زمانہ تھا جب وہ پی ٹی وی پر فہم القرآن کے نام سے پروگرام کرتے تھے۔ اس کا آغاز 80ء کے عشرے کے نصف اول میں ہوا ہوگا کیوں کہ تب میں خانیوال کے ایک پرائمری اسکول میں پڑھتا تھا۔ ہر شام

نشریات کا آغاز بصیرت نام کے پرو گرام سے ہوتا تھا لیکن ہفتے میں ایک بار جو بصیرت علامہ صاحب کی گفتگو سے ملتی، وہ انمول تھی۔ قرآن کو ترجمے سے پڑھنے کی تحریک مجھے ان کی تقاریر سے ملی۔

کراچی منتقل ہونے کے بعد 1985 کے محرم میں پہلی بار علامہ صاحب کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ انچولی سوسائٹی کا بارگاہ شہدائے کربلا ابھی تعمیر نہیں ہوا تھا۔ جہاں آج امام حسین کی ضریح کی شبیہ موجود ہے، وہاں شامیانہ لگا کر رات کے نو بجے مجلس منعقد کی جاتی تھی۔ چند سو افراد سے زیادہ کا مجمع نہیں ہوتا تھا۔

اس سال علامہ طالب جوہری نے سورہ فیل کی تفسیر پڑھی۔ میں نے منبر کے بالکل سامنے بیٹھ کر انھیں سنا۔ تب میں ساتویں جماعت کا طالب علم اور ان کے علمی مرتبے سے ناواقف تھا۔ سچی بات ہے کہ پہلی مجلس میں ایک ٹی وی کی شخصیت کو دیکھنے کے شوق میں گیا تھا۔

خطاب ختم ہونے سے پہلے میں خود سے وعدہ کر چکا تھا کہ روزانہیں سننے آؤں گا۔ علامہ صاحب منبر سے اترے تو میں اُن سے ہاتھ ملانے کو آگے بڑھا۔ لیکن

یہ دیکھ کر ششدر رہ گیا کہ ان کا قد مجھ سے بھی کم تھا۔ اس سے پہلے میں اپنے چھوٹے قد پر دن رات کڑھتا تھا۔ اس کے بعد زندگی بھر کے لیے یہ رنج ختم ہو گیا۔ علامہ صاحب جیسے لوگ کم ہوتے ہیں جن کی قامت میں منبر کی بلندی بھی شامل ہو جاتی ہے۔

اس کے بعد کوئی سال ایسا نہیں گزرا کہ میں نے پاکستان میں ہوتے ہوئے علامہ صاحب کے عشرۂ محرم کی مجالس نہ سنی ہوں۔ وہ کسی سال ایک اور کسی سال دو عشرے پڑھتے تھے۔ طویل عرصے تک نشتر پارک کی مرکزی مجلس ان سے منسوب رہی۔ دوسرا عشرہ کبھی وہ انچولی میں پڑھتے اور کبھی رضویہ میں۔

بارگاہ شہدائے کربلا کراچی کے بڑے امام باڑوں میں سے ایک ہے۔ ہزاروں افراد اس میں سما جاتے ہیں۔ اس کے بعد بڑا احاطہ ہے۔ اسی احاطے میں مسجد خیر العمل ہے۔ ایسا دسیوں بار ہوا کہ میں گھر سے نکلا اور مجلس میں نہیں پہنچ سکا۔ امام بارگاہ، مسجد، احاطہ، رشید ترابی پارک، سڑکیں، گلیاں، سامنے کا میدان، سب کھچا کھچ بھرے ہوتے۔ ہر جگہ لاؤڈ اسپیکر لگا دیے جاتے تاکہ جو جہاں ہے، وہاں بیٹھ کر علامہ صاحب کا خطاب سن لے۔

تیس سال تک میں نے علامہ صاحب کو جب دیکھا، منبر پر دیکھا۔ انھوں نے متعدد کتابیں لکھیں اور میں انھیں ایک ایک کر کے پڑھتا چلا گیا۔ معلوم ہوا کہ وہ فقط ذاکر نہیں بلکہ مجتہد بھی ہیں۔ مجتہد وہ ہوتا ہے جو اجتہاد کر سکتا ہے، جو فتویٰ دے سکتا ہے۔ فقہ جعفریہ میں مجتہد بننے کے لیے عراق کے شہر نجف یا ایران کے شہر قم میں برس ہا برس تعلیم حاصل کرنا پڑتی ہے۔

علامہ طالب جوہری نے 27 اگست 1938 کو بہار کے شہر پٹنہ میں جنم لیا تھا۔ ان کے والد مصطفیٰ جوہر بہت بڑے عالم اور شاعر اہلِ بیت تھے۔ قیام پاکستان کے بعد یہ خانوادہ کراچی منتقل ہوا۔ طالب جوہری نے ابتدائی تعلیم والد سے حاصل کی۔ پھر مزید تعلیم کے لیے نجف گئے۔ وہاں آیت اللہ العظمیٰ ابوالقاسم خوئی اور آیت اللہ باقر الصدر کے شاگرد رہے۔ آیت اللہ علی سیستانی ان کے ہم جماعت تھے۔

اتفاق سے میں انچولی میں آٹھ سال تک علامہ طالب جوہری کا ہمسایہ رہا ہوں۔ ایک گلی میں ان کا گھر اور برابر والی گلی میں میرا قیام تھا۔ لیکن کبھی ان کی خدمت میں حاضری دینے کی ہمت نہیں پڑتی تھی۔ ایک بار لاہور میں علامہ احمد

جاوید سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے بتایا کہ وہ کراچی میں انچولی کے قریب رہتے تھے تو علامہ طالب جوہری سے اکثر ملاقاتیں رہتی تھیں۔ اس گفتگو میں انھوں نے یہ بتا کر حیران کیا کہ علامہ صاحب مہمل شاعری کے ماہر ہیں اور انھوں نے پوری پوری غزلیں ایسی کہیں ہیں جن کا کوئی مطلب نہیں نکلتا۔

میں اکثر ادیبوں شاعروں سے ان کی کتابوں پر دستخط کرواتا رہتا تھا۔ علامہ احمد جاوید سے ملاقات کے بعد کراچی آکر میں نے علامہ صاحب کا ایک مجموعہ کلام تلاش کیا اور دستخط کروانے ان کے گھر پہنچ گیا۔ علامہ صاحب سو رہے تھے۔ میں اپنی ایک کتاب اور ان کا مجموعہ کلام چھوڑ آیا۔

شام کو علامہ صاحب کی کال آئی۔ انھوں نے فوراً طلب فرمایا۔ میں پہنچا تو انھوں نے ایک دلچسپ کہانی سنائی۔ علامہ صاحب نے کہا کہ جنگ کے بانی میر خلیل الرحمان سے کسی بات پر وہ خفا ہو گئے تھے۔ اس کے بعد انہوں نے اخبار پڑھنا بند کر دیا تھا۔ چند دن پہلے ان کے ایک واقف آئے تو ان کے پاس اخبار کے چند تراشے تھے۔ یہ سو لفظوں کی کہانیاں تھیں جو انھوں نے علامہ صاحب کو پڑھ کر سنائیں۔ انھوں نے دریافت کیا کہ یہ کس نے لکھی ہیں؟ اس شخص سے

ملواؤ۔ ان صاحب نے کہا کہ میں اس لکھنے والے سے واقف نہیں۔ پتا نہیں یہ اتفاق تھا یا علامہ صاحب کی زبان کا اثر کہ ادھر انھوں نے ملنے کی خواہش کی اور میں خود ان کے گھر پہنچ گیا۔

اس کے بعد میں جب تک پاکستان میں رہا، ہر کچھ عرصے کے بعد ان کے ہاں جاتا رہا۔ ان کی نجی محفل میں بھی علما آتے تھے اور کسی ایک مسلک کے نہیں، ہر مکتب فکر کے علما۔ مجھے جاتے ہوئے شرم آتی تھی لیکن پھر کسی دن علامہ صاحب کا فون آتا اور وہ کہتے، میاں کدھر ہیں آپ؟ جلدی سے آجائیں۔

فقط عالمِ دین ہونا بھی کم نہیں لیکن علامہ صاحب اس سے بہت بڑھ کر تھے۔ غیر معمولی شاعر تھے۔ ادب کے بے حد عمدہ پارکھ تھے۔ فلسفی تھے۔ تاریخ دان تھے۔ اور جس موضوع پر مجھ سے گفتگو کرنا پسند کرتے تھے وہ ان کا کتابیں جمع کرنے کے شوق تھا۔ انچولی میں مکان کی ایک منزل اور نیو رضویہ سوسائٹی میں پورا مکان کتابوں سے بھرا ہوا ہے۔ میں نے کئی بار علامہ صاحب کو پرانی کتابیں پیش کیں۔ وہ بہت خوش ہو کر کتب کا تحفہ لیتے تھے۔ اس کے بعد اس موضوع کی کتابوں کا تذکرہ شروع کرتے تو علم کے دریا بہا دیتے۔

ایک بار ان کتابوں کا تذکرہ ہوا جن پر پابندی لگی اور وہ نایاب ہو گئیں۔ علامہ صاحب نے ایسی لغات اور کتابوں کی لمبی فہرست بیان کی جو ان کے پاس تھیں۔ان میں 1926 میں شائع ہوئی طحہ حسین کی کتاب فی الشعر الجاہلی شامل تھی۔

ایک بار میں نے علامہ صاحب سے اپنی گمراہی کا ذکر کیا اور چند ایک کتابوں کے نام لیے جو گمراہ کن اثرات رکھتی ہیں۔ میرا خیال تھا کہ وہ مجھے ڈانٹیں گے یا عالمِ دین ہونے کے ناتے ذکر و تبلیغ کریں گے۔ لیکن انھوں نے علمی گفتگو شروع کر دی اور مجھے کئی کتابوں کے نام بتائے کہ اگر گمراہ ہونا ہے تو ٹھیک طرح سے ہو جاؤ۔ ادھورا علم کسی کام کا نہیں ہوتا۔

کسی موقع پر میں نے سوال کیا کہ کیا واقعی آیت اللہ سیستانی آپ کے ہم جماعت تھے۔ علامہ صاحب نے کہا کہ یہ بات درست ہے۔ یوں درست ہے کہ ہم دونوں آقائے خوئی کے درس میں ساتھ بیٹھتے تھے۔ لیکن جو میرا پہلا سال تھا، وہ سیستانی صاحب کا 17 واں سال تھا۔ وہ مجھ سے بہت سینئر ہیں۔

دسمبر 2018 میں آخری بار ملاقات ہوئی تو علامہ صاحب کے پیر پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ میں نے پوچھا، یہ کیا ہوا؟ انھوں نے فرمایا کہ شوگر بڑھ گئی ہے۔ انگوٹھے میں زخم ہو گیا تھا۔ ڈاکٹروں نے کاٹ دیا۔ وہ تکلیف میں تھے لیکن اس کا اظہار نہیں کرتے تھے۔ بینائی بے حد کمزور ہو چکی تھی۔ لیکن آواز میں وہی زور اور گرج برقرار تھی جوان کا خاصہ تھی۔

گزشتہ سال میرا کربلا کا سفر نامہ شائع ہوا تو میں نے ایک دوست سے کہا کہ علامہ صاحب کو میری طرف سے پیش کر دو۔ دوست نے وہ انہیں پہنچایا اور درخواست کی کہ کیا میں ایک تصویر لے لوں جس میں آپ یہ کتاب پڑھ رہے ہوں۔ علامہ صاحب نے کہا، آج نہیں۔ پہلے مبشر میاں سے کہو کہ ہمیں فون کریں۔ وہ ہدیہ ملے گا تو پھر آکر تصویر اتار لینا۔

علامہ صاحب کو شوگر تھی۔ دل کا عارضہ تھا۔ ہارٹ اٹیک ہو چکا تھا۔ کئی بار اسپتال میں داخل ہو کر واپس آئے تھے۔ اس بار معلوم ہو گیا تھا کہ وہ رخصت ہونے والے ہیں۔ وینٹی لیٹر پر جا چکے تھے۔ کئی بار موت کی افواہ عام ہوئی تھی۔

اس کے باوجود جب ایک معتبر دوست نے فون کیا کہ آج سچ مچ علامہ صاحب چلے گئے تو دل بیٹھ گیا۔

بیشتر لوگ یہی کہہ رہے ہیں کہ ایک عالم دین کا انتقال ہو گیا۔ لیکن علمائے دین اور بہت سے ہیں۔ علامہ ایک دبستاں تھے۔ ادیب اور شعرا بہت سے ہیں۔ علامہ پوری تہذیب تھے۔ تاریخ داں بہت سے ہیں۔ علامہ خود چلتی پھرتی تاریخ تھے۔

منبر نے علامہ کا قد بڑھایا تھا۔ علامہ نے منبر کی توقیر بڑھائی۔ ایسا علم کا طالب اور کتابوں کا جوہری ہم دوسرا نہ دیکھ پائیں گے۔

علامہ طالب جوہری: میں نے کیسا پایا؟

سید عدنان کریمی

24جون،2020ء

سوال کیا کہ آپ کس سے متاثر ہیں؟ جواب ملا میں آج تک کسی سے متاثر نہیں ہوا بلکہ اپنے اساتذہ کے سامنے کئی مرتبہ امام خمینی سے بھی زبردست علمی اختلاف کیا۔ سوال ہوا کہ آپ ایک اہلِ تشیع عالم دین ہونے کے ساتھ ساتھ ایک بہترین ادیب بھی ہیں، اس تناظر میں مولانا آزاد کے طرزِ تحریر کو کس طرح پاتے ہیں؟ جواب آیا کہ مولانا آزاد اپنی تحریروں میں نہایت تکلف برتتے تھے، کانٹ چھانٹ کر، ڈھونڈ ڈھانڈ کر جملے تراشتے تھے۔ بے نیازی، احساس برتری اور تجاہلِ عارفانہ میں وہ اپنی مثال آپ تھے، یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنی تفسیر کا انتساب بھی ایک ایسے نامعلوم افغانی شخص کے نام کرنے کی خواہش کا اظہار کیا جو ان سے چند ایک مقاماتِ قرآنیہ سمجھنے کا خواہشمند تھا، نام یاد نہ ہونے کی وجہ سے انتساب کھٹائی میں پڑ گیا اور مولانا آزاد انتساب کی جھنجھٹ سے بچ گئے۔ ہم نے چائے کی چسکی لی اور علامہ صاحب نے

سگریٹ کا کش لگایا تو ایک اور سوال کلبلانے لگا، سوال داغا کہ آپ ایک منجھے ہوئے صاحبِ مطالعہ فلسفی بھی ہیں، فلسفہ پر ''عقلیاتِ معاصر'' جیسی لاجواب کتاب بھی آپ ہی کا کارنامہ ہے، ان سب کے باوجود کیا کبھی خدا کی ذات کے بارے میں تشکیک میں مبتلا ہوئے؟ ایسا زوردار قہقہہ لگایا ہم سمجھے کہ سگریٹ کے دھوئیں کے مرغولہ میں ہمارا سوال بھی تحلیل ہو گیا، لیکن ایسا نہیں ہوا بلکہ کچھ دیر توقف کے بعد بولے کہ یہ فلسفہ بھی ایک فتنہ ہے، جتنی گہرائی اتنی شیطانی۔ جب بھی کسی انسان نے بغیر کسی نظریہ وعقیدہ کے فلسفہ کا مطالعہ کیا وہ گمراہی کے دلدل میں دھنستا چلا گیا۔ فلسفی پر ایک وقت ایسا آتا ہے کہ وہ اپنی ذات کا بھی منکر ہو جاتا ہے بلکہ اگر اُسے ''امام المنکرین'' کہا جائے تو کوئی مبالغہ نہ ہو گا۔ میں خدا سے ڈرتے ڈرتے فلسفہ پڑھتا ہوں، عقل کو قابو میں رکھتا ہوں اور تشکیک و گمراہی کو بھی خدا ہی سے ڈراتا ہوں، کیونکہ خدا ہی ہر شے کا خالق اور ہر چیز اسی کی مخلوق ہے۔

لفظ و معنی کیا ہیں، حرف و صوت کی دنیا ہے کیا

دل نے سمجھا یا تھا کیا، اور عقل نے سمجھا ہے کیا

سامنے میز پہ دھری علامہ کی کتاب ''حرفِ نمو'' دیکھ کر یاد آیا کہ آپ تو ایک نعت گو شاعر اور مرثیہ خواں بھی ہیں۔ ہم نے نعت سنانے کی فرمائش کی تو کہا کہ اس کتاب میں سے چند اشعار منتخب کر کے آپ میں سے کوئی دوست ہمیں بھی سنائے۔ ہمارے دوست نے ان کی ایک نعت سنائی، ذیل میں اقتباس ملاحظہ فرمایئے۔

پھونک کر دشتِ عرب کی کوکھ میں رُوحِ اِرم
اِک گھنیری چھاؤں پھیلادی سرِ فرقِ امم

وہ قدیم انسان، تخلیقِ جہاں سے بھی قدیم
جس کے احساسات کی تجسیم ہیں لوح و قلم

وہ بقاپرور کہ بامعنی ہے مفہومِ وجود
وہ فنادشمن کہ اب اِک لفظ مہمل ہے عدم

وہ ازل آثار، تعلیمِ ملائک جس کی بھیک
وہ ابد کردار، جنّت جس کے دروازے پہ خم

جس کے بل پر ناز کرتا ہے امانت کا مزاج
جس کے دم سے سانس لیتا ہے دیانت کا بھرم

اُس سے باتیں کر کے پالے ہم کلامی کا شرف
تھم، خدا کے واسطے، اے نارسا ادراک تھم

اے قضا آگاہ مرسل اے قدر پیما نبی
اے عمودِ خیمۂ جاں اے وجودِ کیف و کم

تُو دیارِ آگہی میں رب کے ہونے کا نشاں

تُو فصیلِ فہم پر توحیدِ خالق کا عَلم

عقل کی خاکِ تیمّم ہے ترے قدموں کی دھوُل

فکر کا آبِ وضو ہے تیری پیشانی کا نَم

مرحلہ وار دو مختلف قسم کی چائے کی تواضع کے بعد اچانک ذہن میں ایک سوال بجلی کی طرح کوندا، پوچھے بنا چارہ نہ تھا اور جواب سُنے بنا گویا محفل ادھوری تھی۔ ہمت مجتمع کر کے ہم نے استفسار کیا کہ شیعہ سُنّی اختلافات کی اصل وجہ کیا ہے؟ کیا بین المسالک تنازعات کا خاتمہ ممکن ہے؟ علامہ کی انگلیاں تسبیح کے دانوں پر جم گئیں، بیٹھنے کی ہیئت تبدیل کرتے ہوئے گویا ہوئے، معافی چاہتا ہوں مجھے نہیں معلوم کہ آپ کا تعلق کس مسلک اور فرقہ سے ہے لیکن مجھے اتنا ضرور علم ہے کہ آپ مسلمان ہیں۔ قطع نظر مسالک اور فرقوں کے، مجھے یہ

کہنے میں کوئی عار نہیں کہ ہم علماء ہی اس فساد اور تنازعہ کا اصل سبب ہیں، میری مجلس اور میرا نوحہ اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتا جب تک کہ میں فساد فی الارض ٹائپ کی بات کر کے داد نہ سمیٹوں۔ اور ہمارے دوسری طرف والے احباب، اُن کی بھی کوئی محفل اور بیٹھک اس وقت تک تمام نہیں ہوتی جب تک وہ بھی کوئی متنازعہ اور مار دھاڑ کی بات کر کے سامعین سے ''سبحان اللہ'' نہ کہلوائیں۔ مسئلہ صرف پیٹ، حُبِّ جاہ اور واہ واہ کا ہے جو ہمیں کسی طور بھی سکھ سے بیٹھنے نہیں دیتا۔ آگ ہی آگ اور خون ہی خون ہے اس دشت میں ہم سب قابیل بنے پھر رہے ہیں۔

افسردگی کے ماحول میں پورے کمرے میں سنّاٹا طاری تھا ایسے میں علامہ صاحب کی آواز گونجی۔ ''عباس! ایک چائے اور لایئے!''۔ ہم نے گھڑی کی طرف دیکھا تو رات کے ٹھیک گیارہ اور ہمارے ساتھی کے چہرے پر پورے بارہ بج رہے تھے۔ اجازت چاہی تو علامہ صاحب کھڑے ہو گئے، بغل گیر کیا اور بڑے چاؤ سے کہنے لگے، آتے رہا کیجیے مل بیٹھ کر گپ شپ کیا کریں گے۔

ایک گم راہ کا مرشد: طالب جوہری

حاشر بن ارشاد

22جون،2020ء

گھر میں نماز پڑھنا اور روزے رکھنا تو سکھایا گیا لیکن کسی نے یہ نہیں بتایا کہ مسلک کس بلا کا نام ہے۔ گھر سے الگ الگ سمتوں میں تین مساجد تھیں جہاں مختلف اوقات میں جمعہ ہوتا۔ جمعے کا دن آتا تو اصول یہ تھا کہ ابو کے ساتھ سب بھائی اکٹھے نکلیں گے۔ یہی اصول عید کی نماز کے لیے بھی تھا۔ اب کسی روز سب جلدی تیار ہو جاتے تو کسی روز کوئی ایک تاخیر کا سبب بن جاتا۔ ایک مسجد میں جمعہ یا عید نہ پڑھ پاتے تو دوسری کا رخ کر لیتے، وہاں بھی قضا ہو جاتا تو تیسری مسجد تو تھی ہی۔ نمازیوں کو دیکھتے تو ہر جگہ ان کے طریق میں کچھ فرق پاتے پر ہم اسی طریق پر ہاتھ باندھتے جیسا گھر میں سکھایا گیا تھا۔ نماز کے بعد کہیں ذکر بالجہر ہوتا تو ہم بھی کر لیتے ورنہ سیدھے سبھاؤ دعا مانگ کر گھر چلے آتے۔ یہ تو بہت بعد میں معلوم ہوا کہ ایک مسجد دیوبندیوں کی ہے، ایک

بریلویوں کی اور ایک اہل حدیث کی اور سب کو ایک دوسرے سے فاصلہ رکھنے کا حکم ہے کہ مسلک میں ہر وقت وبا کی حالت رہتی ہے۔

شیعہ سنی میں فرق البتہ جلدی معلوم ہو گیا کیونکہ ان کا امام باڑہ جو گھر سے نظر آتا تھا، وہاں ابو کبھی نہیں لے کر گئے۔ رمضان میں جب یہ معلوم ہوا کہ ان کا روزہ تاخیر سے کھلتا ہے تو ان پر ترس بھی آیا لیکن اس سے زیادہ کیا فرق ہے، کیا فرق ملحوظ رکھنا ہے، اس کی کسی نے تعلیم دینے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ محرم میں تعزیہ نکلتا تو دیکھنے والوں میں ہم بھی شریک ہو جاتے۔ کچھ اور بڑے ہوئے تو کچھ شیعہ دوستوں کے ساتھ مجلس میں بھی جانا شروع کر دیا۔ اس وقت امام باڑے کے دروازے پر کوئی نام نہیں پوچھتا تھا، کوئی شناختی کارڈ بھی نہیں دیکھتا تھا، لیکن یہ وہ وقت تھا جب کسی نے کمر سے قمیض ہٹا کر گولی مارنا بھی نہیں سیکھا تھا۔ ذبیحے کا تعلق ابھی صرف عید اور جانوروں سے تھا، انسانوں کی باری آنے میں ابھی دیر تھی۔

ہمارا مسلک، گرچہ ہم اس سے واقف نہیں تھے، ذرا خشک سا مسلک تھا۔ اس میں کوئی ایسی تہذیبی رمق نہیں تھی جس کا تعلق انسانوں کے اکٹھ سے ہو، ان

کی خوشی یا غم کے اشتراک سے ہو۔ موسیقی پر کوئی پابندی تو نہیں تھی لیکن یہ معلوم تھا کہ اسے کوئی اچھا بھی خیال نہیں کیا جاتا۔ عیدین پر لوگوں سے گلے مل لیتے تھے، کچھ پکوان پکا لیتے تھے، بس ہو گئیں رسومات، رواج بھی اتنے ہی تھے، اس کے بعد ثقافت کی سرحد ختم ہو جاتی تھی۔ ایسے میں ایک ایسے بچے کے لیے جس میں تخلیق کے کچھ جرثومے بچپن سے اپنا رنگ دکھا رہے تھے، عید میلادالنبی کی پہاڑیاں اور محرم کے تعزیے ہی وہ مظہر تھے جو اس کا ایک ان دیکھی مذہبی ثقافت سے رشتہ جوڑتے تھے اس لیے ہم ربیع الاول اور محرم دونوں کا بڑی دلجمعی سے انتظار کیا کرتے۔

عید میلادالنبی کا حلیہ ہمارے بچپن سے جوانی تک آتے آتے ایک غیر محسوس طریقے سے بدلتا گیا۔ لاہور میں اس عید پر دکانیں، بازار اور مساجد سبز قمقموں سے جگمگا اٹھتیں۔ جگہ جگہ لوگ مٹی کے چھوٹے چھوٹے ٹیلے بناتے۔ لاہور کی روایت میں یہ پہاڑیاں کہلاتی تھیں۔ ان پر آرائشی روشنیاں لگائی جاتیں۔ کھلونے سجائے جاتے۔ کوئی اختراع کر کے اسی میں ایک چھوٹی سی پن چکی بناتا۔ کسی کی پہاڑی سے جھرنا پھوٹتا۔ کہیں سرنگوں سے کھلونا ٹرین برآمد ہوتی۔ ایک طویل بازار میں ایسی درجنوں پہاڑیاں سج جاتیں جن میں باقاعدہ مقابلہ

ہوتا کہ کس کی پہاڑی خوبصورتی اور جدت میں دوسروں سے بڑھ کر ہے۔ شہر میں پیدا ہونے اور پلنے بڑھنے والے بچے کے لیے میلوں ٹھیلوں کا بس یہی نعم البدل تھا۔ لیکن پھر فلوٹس نے آہستہ آہستہ پہاڑیوں کی جگہ لے لی۔ نو آموز، کچے پکے لیکن مخلص نعت خوانوں کی جگہ لاؤڈ سپیکر پر پیشہ ور نعت خوانوں اور قوالوں کی ہر جگہ ایک ہی جیسی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ تہذیب اپنے ارتقا سے گزر رہی تھی لیکن یہ ارتقا ہمارے لیے خوش کن نہیں تھا۔ اس نئی طرح کی عید سے جلد ہی دل کھٹا ہو گیا۔

محرم میں لیکن ایسی صورت حال نہیں تھی۔ ہر برس بعینہ پچھلے برس کی طرح مجالس ہوتیں، علم برآمد ہوتے، تعزیے کا جلوس ہوتا، ذوالجناح کو سجا کر باہر لایا جاتا، ایک ردھم سے ماتم ہوتا۔ اس سب سے میری جڑت قائم رہی۔ رہی زنجیر زنی اور قمہ زنی، تو اس سے تب بھی میں وحشت محسوس کرتا اور اب بھی کرتا ہوں۔ یہ ویسی ہی وحشت تھی جو بڑی عید کے دنوں میں مجھے گھیر لیتی۔ خون کا بہنا مجھے پسند نہیں تھا خواہ انسان کی پیٹھ سے بہتا ہو یا جانور کے حلقوم سے۔ خود اذیتی کی کوئی تفہیم نہ میں تب کر پاتا تھا نہ اب کر پاتا ہوں۔ سو ادھر زنجیر زنی شروع ہوتی ادھر میں گھر کو لوٹ جاتا۔

گھر کے پاس موجود امام باڑے میں مجالس میرے لیے کوئی خوش کن تجربہ ثابت نہیں ہوئیں۔ ظاہر ہے اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ میری مذہبی تربیت غیر روایتی تھی۔ دوسرا یہ کہ اس غیر روایتی تربیت کی جڑیں بھی اس گہری عقیدت کی مٹی میں پیوست نہیں تھیں جو اہل تشیع کو رسول اللہ کے خانوادے سے تھی۔ لیکن اس سے بھی بڑی وجہ یہ تھی کہ میں بیان کے اس طریق سے اپنے آپ کو ہم آہنگ نہیں کر پاتا تھا جس میں گھنٹوں ایک ہی زاویے سے تاریخ پر روشنی ڈالی جاتی۔ وہی واقعات کا تسلسل، ذکر میں غلو کی آمیزش، مافوق الفطرت واقعات، ایک ہی طرح سے ذکر کی اٹھان اور بنت اور پھر تقریباً ایک ہی جیسا اختتام مجھے متاثر نہ کر پاتا۔ اس میں شک نہیں تھا کہ ذاکرین کا انداز بیان دلچسپ ہوتا تھا لیکن اس میں کسی سوچنے والے ذہن کے لیے کچھ نہیں تھا۔ جن مساجد میں جمعہ اور عید پڑھتا، ان کے خطبے بھی مجھے تصنع اور بناوٹ لگتے۔ اس لیے مسجد کے خطبوں اور امام باڑوں کی مجالس، دونوں سے جلد ہی کنارہ کشی اختیار کر لی۔

لیکن اس بیچ ایک خطیب، ایک ذاکر ایسا تھا جس کو میں نے کبھی اپنے سامنے نہیں دیکھا لیکن جس سے میرا رشتہ روز گہرا ہوتا چلا گیا۔ زندگی کی اس گھڑی

تک، جو بیت رہی ہے، میں کبھی اس سے اپنا دامن نہ چھڑا سکا۔ تو چلیے یہ کہانی بھی سن لیجیے:

ابو یوں تو کٹر سنی تھے اور کافی مذہبی بھی۔ محرم کے دنوں میں بھی ان کے معمولات وہی رہتے جو کہ پہلے تھے ماسوائے ایک تبدیلی کے اور وہ یہ کہ اگر ٹیلی ویژن پر ضیاء محی الدین، شجاعت ہاشمی یا طلعت حسین تحت اللفظ مرثیہ پڑھتے تو وہ بڑی دلجمعی سے اسے سنتے۔ اسی طرح مجلس شام غریباں بھی وہ لازمی دیکھا کرتے۔ کیوں، یہ ایسا سوال ہے جو میں نے کبھی کیا نہیں اور ایسا جواب ہے جسے دینے کی انہوں نے کبھی ضرورت محسوس نہیں کی۔ ابو کی دیکھا دیکھی بہت چھوٹی عمر سے میں بھی ان کے ساتھ بیٹھ کر مجلس دیکھنے لگا گیا۔ لیکن یہاں بھی وہی مسئلہ درپیش تھا۔ چند سال بعد احساس ہوا کہ یہ تو وہی باتیں ہیں جو پچھلے برس بھی سنی تھیں۔ وہی اٹھان ہے جو پہلے بھی دیکھ چکا ہوں۔ وہی پرانے فقرے ہیں۔ میں یہ بھی بتا سکتا ہوں کہ کہاں پر گریے کا شور اٹھے گا اور کہاں دبی دبی سسکیاں سنائی دیں گی۔ کب ذاکر خاموشی کے وقفے لے گا اور کب اس کی آواز اونچی ہوتی چلی جائے گی۔ قصے بھی وہی ہیں، کہانیاں بھی وہی ہیں۔ آغاز بھی ایک سا، انجام بھی ایک سا۔ احساس ہوا کہ اس میں تو سیکھنے کے

لیے نیا اب کچھ نہیں ہے۔ پر اس سے پہلے کہ ٹیلی ویژن پر مجلس دیکھنے اور سننے کی روایت مجھ سے چھوٹتی، پاکستان ٹیلی ویژن نے علامہ طالب جوہری کو منتخب کر لیا۔

طالب جوہری کو پہلی دفعہ سننا ایک بہت ہی مختلف تجربہ تھا۔ اس سے پہلے میں نے ایسا کوئی ذاکر دیکھا تھا نہ ایسا عالم اور نہ ایسا خطیب۔ ایک ایسا مقرر جو منبر پر بیٹھ کر بڑے دھیمے انداز میں اپنی بات سامنے رکھتا ہے، ایک مقدمہ تشکیل دیتا ہے، استدلال کا انبار ایسے لگاتا ہے کہ ایک لمحہ بھی بوجھل پن کا احساس نہیں ہو پاتا۔ نہ وہ زانو پیٹتا ہے نہ اپنی دستار اتار پھینکتا ہے۔ اسے آنکھ سے بہنے والے آنسو کی نسبت دل میں گھر کرنے والی دلیل سے مطلب ہے۔ علامہ کی مجلس ایسی ہوتی تھی جیسے باخ دھن تخلیق کر رہا ہو، میکال اینجلو مجسمہ تراش رہا ہو یا ریمبراں رنگوں سے ایک شاہکار کینوس پر اتار رہا ہو۔ ایک ایک سر، ایک ایک ضرب، ایک ایک برش سٹروک ٹھیک اپنی جگہ بیٹھتا دکھائی دیتا تھا۔

ایک جھرنا تھا جو بلمپت لے میں بہتا تھا۔ آہستگی سے، دھیمے دھیمے یہ جھرنا ایک شانت دریا میں مل کر ایک وشال سمندر میں اتر جاتا تھا۔ لیکن کہیں کوئی شور

نہیں تھا، بس ایک نغمگی کی سی کیفیت تھی۔ جزو سے کل کا سفر کب طے ہوتا تھا، معلوم ہی نہیں ہوتا تھا۔ علامہ خود تو منبر پر جم کر بیٹھتے تھے لیکن ان کے ہاتھ پر موڑ پر نرتکی کے بھاؤ بتاتے تھے۔ انگلیوں کی ہر جنبش کے ساتھ استدلال ایک نئی کروٹ لیتا تھا۔ اور گرفت ایسی تھی کہ سننے والا پلک نہیں جھپک سکتا تھا۔ علامہ کے منشور سے گزرنے والی تاریخ کی روشنی کا ہر رنگ الگ دکھائی دیتا تھا۔ منطق اور دلیل سے بنے ایک دھاگے میں ازل سے ابد تک بکھرے بے ترتیب واقعات ایک تسبیح کی شکل میں جڑتے چلے جاتے تھے۔ اس کا ورد کرتے تھے تو سوچ کے اور زاویے کھلتے چلے جاتے تھے۔ علامہ میری زندگی کے ان اولین اساتذہ میں سے تھے جن سے میں نے استنباط اور استقرا کا سبق لیا۔ اس روشنی کا پرتو آج بھی میری راہ کا چراغ ہے۔ یہ ایسا احسان ہے جس کا بار اتارنا ممکن نہیں ہے پر یہ وہ بار نہیں ہے جس سے کمر خمیدہ ہوتی ہو۔ یہ تو وہ زادراہ ہے جو ہر نسل پر فرض ہے کہ وہ اگلی نسل کو منتقل کرے۔

علامہ کی مجالس سنیں۔ پھر فہم القرآن کے کتنے ہی پروگرام۔ انٹرنیٹ اور یو ٹیوب کی بدولت ان کے ان خطبات تک بھی رسائی ہوئی جو پی ٹی وی کی زینت

نہ بن سکے۔ یہ حسرت البتہ ہمیشہ رہی کہ ان سے مل سکوں، ان کے سامنے بیٹھ کر ان کو سن سکوں۔ پر آج یہ خبر ملی کہ وہ رخصت ہوئے۔

گزرے برسوں میں وہ بچہ اب سفید بالوں والا ایک بوڑھا بن گیا ہے جس نے سوچنے کے سبق علامہ طالب جوہری سے لیے تھے۔ زندگی کے سفر میں یہ بوڑھا شاید ان راستوں کا مسافر تو نہیں رہا جس کی پگڈنڈیوں کو علامہ اس وقت تراشا کرتے تھے لیکن مجھے یقین ہے کہ علامہ اس گمراہی پر ہر گز خفا نہ ہوتے۔ کیونکہ انہی کی بیعت میں راستہ جو بھی چنا، دلیل سے چنا، جو چھوڑا وہ دلیل سے چھوڑا۔

پر وہ خفا ہوتے یا راضی، یہ تو جب جان پاتا کہ ان سے کبھی مل پاتا۔ ان کے قدموں میں کچھ دیر بیٹھتا۔ فیض کی کوئی نظر پاتا، حیرت کا کوئی در وا ہوتا، زندگی کی کوئی اور تفہیم عطا ہوتی۔

سو یہ امکان بھی اب معدوم ہوا۔ خواہشیں اگر اسپ ہوتیں تو مجھ سے فقیر کیا شہ سوار ہوتے۔ سو یہ خواہش بھی حسرت ناتمام کے گوشوارے میں ایک اور اندراج ہی رہی۔ آج بچپن کی ایک یاد رخصت ہوئی، ایک عہد تمام ہوا۔ منبر

ویران ہوا۔اب کے محرم آئے گاتو شام غریباں میں دو آنسو طالب جوہری کے نام کے بھی ہوں گے۔

روایت کی موت

انعام رانا

25جون،2020ء

اسّی کی دہائی تھی اور گھر سُنیوں کا تھا۔ لیکن ابھی ضیائیت کے بچھائے بیج کی فصل پک کر تیار نہ ہوئی تھی۔ سو شاید آخری نسل پروان چڑھی جہاں اہل بیت اطہار سلام اللہ علیہم اجمعین کسی چونکہ اگرچہ چنانچہ کے بنا مشترکہ تھے۔ نہ تو شیعوں نے ان پہ حق ملکیت مکمل کیا تھا کہ شخصی اختلاف پر بھی دشمن اہل بیت ع کا نعرہ لگا دیں اور نہ ہی سُنی ان کا ٹھیکہ شیعوں کو دے کر دس محرم کو کرکٹ کھیلنے نکل پڑے تھے۔ محرم کا احترام کسی آرڈیننس سے نہیں بلکہ صدیوں سے موجود روایات سے قائم تھا۔ منبر پہ بیٹھے ذاکر مذہب اور تاریخ کے ساتھ زبان و ادب کے بھی ماہر تھے اور سامعین بھی رونے کیلئے فقط غم حسین علیہ سلام پہ قانع تھے۔ منبر سے ذو معنی گفتگو تب بھی ہو جاتی تھی، کوئی نعرہ سامعین سے بھی لگ جاتا تھا مگر خود اہل تشیع میں اسے خاص پذیرائی نہ تھی۔ رہے سنی، تو

محرم کی سبیلیں لگاتے اور نیاز کھاتے اور ختم دلاتے تھے اور جو شخص محرم کے غم میں مبتلا نہ دکھے اسے ''وہابی لگدا اے'' پکار لیتے تھے۔

اسی دور کی، جسے گزرے تاریخ کی کتاب کا پیرا ابھی مکمل نہیں ہوا مگر اثرات نسلوں پر ڈال گیا، ایک بچہ اپنے باپ کی گود میں بیٹھا واحد ٹی وی چینل پی ٹی وی دیکھ رہا تھا۔ بچے کو کیا معلوم کہ شام غریباں کیا ہے یا سامنے یہ اونچے بیٹھے صاحب کے گرد آہ و بکا کیوں برپا ہے۔ وہ تو دیکھتا تھا کہ ہمیشہ ہی سنجیدہ رہنے والے باپ کا چہرہ مزید سنجیدہ ہے اور ماں کے آنسو نہیں رکتے۔ طالب جوہری کا نام جانتے تو بچے کو کچھ اور شام غریباں لگیں، مگر انکا چہرہ اس کے بچپن کی یاد بن گیا۔ زمانے بیت گئے، وقت اور رویئے بدل گئے، بچے کو گود میں اٹھانے والا باپ گور جا پہنچا، بچہ چالیس کی عمر کو آن لگا مگر آج بھی طالب جوہری اپنے مخصوص انداز میں مجلس شروع کرتے تھے تو وہ فوراً سے اپنے باپ کی گود میں جا بیٹھتا تھا۔ طالب جوہری اس کیلئے اسکے باپ کے قرب، اسکی گود کی گرمائش کا استعارہ تھا، اسکے بچپن کی حسین یاد تھے۔

کچھ عمر بڑھی، کچھ کتب کو چاٹااور اہل علم کے قدموں میں بیٹھے تو اندازہ ہوا کہ طالب جوہری کیاہیں۔ ہر سال فقط ایک گھنٹے میں فصاحت و بلاغت، علم، فلسفہ، تاریخ، عقیدہ اور حسن و معنی قرآن کی ایک آبشار پھوٹتی تھی اور سامع دنگ ہو کر جملے جوڑتا جوڑتا ان آخری پانچ سات منٹ تک آ جاتا تھا جہاں اسلامی تاریخ کے عظیم ترین ظلم پہ خود آبشار شدت غم سے بھیگتے بھیگتے سوکھ جاتی تھی۔ کون تھا جو اپنا مسلک و عقائد اس ایک گھنٹے کیلیئے طاق پہ رکھ کر مجلس جوہری میں فرش پہ نہ بیٹھ جاتا تھا۔اور ہائے کس قدر بدنصیب ہو گا جو نہ بیٹھا۔اور خود طالب صاحب بھی کب شیعہ ذاکر بنے بیٹھے ہوتے تھے۔ وہ تو مفسر قرآن، ماہر علم الکلام، تاریخ دان اور فلسفی بنے علم کے موتی لٹائے جاتے تھے۔ آخری دس منٹ نا ہوتے تو شاید کوئی مانتا ہی نہ کہ ایک شیعہ ذاکر مجلس پڑھنے بیٹھے ہیں۔

دلچسپ بات یاد آئی،اک بار جوہری صاحب کا ذکر چھڑا تو میرے ایک اہلحدیث دوست ہنستے ہوئے بتانے لگے کہ یار میرے سخت گیر والد کٹر وہابی ہیں مگر طالب جوہری کی شام غریباں کبھی نہیں چھوڑتے۔ بلکہ اک سال سنتے سنتے رو پڑے تھے تو اب اندھیرے میں سنتے ہیں۔ خود میرا یہ حال تھا کہ کئی سال اپنے اہل تشیع دوستوں کے ساتھ شب عاشور اندرون لاہور پھرتا رہتا تھا اور صبح اذان

علی اکبر رض سن کر گھر آتا تھا۔ اک بار محسن شاہ نے شکوہ کیا کہ یار تو ہمارے ساتھ شام غریباں سننے کبھی نہیں گیا تو صاف جواب دیا کہ "نہ بھائی جلوس کے چکر میں میں جوہری صاحب کی شام غریباں نہیں چھوڑ سکتا"۔

طالب جوہری صاحب کی یہ عام پسندیدگی بلاوجہ نہ تھی۔ وہ روایت کے امین ہی نہیں بلکہ خود ایک روایت تھے۔ ایسی روایت جہاں علم محبت و اتفاق کے شیرے میں گوندھ کر نیاز کی مانند تقسیم ہوتا تھا۔ ہاں وہ ایک شیعہ تھے، شیعہ ذاکر تھے۔ مگر منبر پہ بلند ہو کر وہ کوئی ایسا جملہ نہیں کہتے تھے جو منبر کی شان سے نیچے ہو۔ وہ سامعین کو فقط رلانے نہیں آتے تھے بلکہ انکی تعلیم کرتے تھے۔ چودہ سو سال سے موجود اختلافی امور انکی تقریر میں کبھی آئے بھی تو وہ گزرتے گزرتے ان پہ اپنا عقیدہ و موقف مہذب زبان سے بیان کرتے ہوئے گزر جاتے تھے، اسے منزل نہیں بنا لیتے تھے۔ سامعین کی واہ واہ کیلئے نہ تبرا کی ضرورت، نہ نصیریت زدہ جملے۔ انکی تقریر کی منزل قرآن کا پیغام اور محبت و غمِ اہلبیت اطہار سلام اللہ علیہم اجمعین تھی۔ سامع خواہ کسی مذہب کسی مسلک کا ہو، وہ اسے بے چین کیے بِنا قرآن کے باغ سے گزارتے گزارتے اس گھر تک

لے آتے تھے جو عظیم تر ہے، جو میرے آقا و مولا صلی اللہ علیہ و آل و سلم کا گھر ہے اور جن کے گھر اور گھر والوں کی محبت ہم سب کا مشترکہ اثاثہ ہے۔

طالب جوہری چلے گئے کہ اک دن سب کو جانا ہے۔ انا اللہ وانا الیہ راجعون۔ مگر مجھے یوں لگا جیسے بچپن مر گیا، جیسے باپ کی گود چھن گئی، جیسے حسین یاد کھو گئی۔ کہیں پڑھا کہ جوہری صاحب کی موت مکتبہ تشیع کا بڑا نقصان ہے تو میں ہنس پڑا کہ انکی موت تو تمام مسلمانوں کا ہی نقصان ہے۔ مگر پھر سوچا کہ نہیں یہ واقعی مکتبہ تشیع کا ناقابل تلافی نقصان ہے۔ جوہری صاحب کا خلا کیا پُر ہو گا کہ وہ خلا ہی اپنے ساتھ لے گئے۔ کون باقی ہے کہ جسکی مجلس میں سنی شیعہ سر جھکائے تعلیم قرآن، حب اہل بیت اطہار ع اور غم کربلا کی آبشار میں اکٹھے بھیگیں، کون باقی ہے کہ جو اس دور پُر فتن میں سُنی اور شیعہ کو جوڑتی ہوئی آخری کڑی کہلائے، کون باقی ہے کہ جو منبر پہ چڑھتے اور اترتے وقت اپنا ایک سا احترام قائم رکھنے میں کامیاب رہے۔ طالب جوہری نہیں مرے صاحب، روایت مر گئی ہے۔

آپ نے گریہ کیا، اجرکم علیٰ اللہ!

علامہ طالب جوہری کی شاعری سے انتخاب

نوید صادق

11مئی،2007ء

میرا آنسو تیری آنکھ سے ٹپکا ہے
جوگی رستہ بھول گیا تھا ڈیرے کا

*****

ڈھل گیا دن اور لمبے ہو گئے پیڑوں کے سائے
تک رہا ہے کب سے تیری راہ گاڑی بان، جا

*****

اُس کا ہر انداز سجیلا بانکا تھا
کچھ تو بتاؤ وہ خوش پوش کہاں کا تھا

ایک طرف سے کھلی ہوئی تھی شیر کی راہ

لیکن اس پر تین طرف سے ہانکا تھا

مت گھبرانا دوست، غبارِ ناقہ سے

ہم نے بھی اس دھول کو برسوں پھانکا تھا

اُس کے گھر سے نکل کر ہم نے شام ڈھلے

کچھ نہیں یاد کہ کتنے گھروں میں جھانکا تھا

*****

یادوں کی الماری کھولے بیٹھا تھا

ایک اندھیرے کمرے میں بوڑھا لڑکا

*****

وہ بوڑھا بھی کتنا دلکش بوڑھا تھا

یادوں کی دہلیز پہ چپکا بیٹھا تھا

شور مچاتے آنسو ٹپ ٹپ گرتے تھے

ہونٹوں پر اک کہر زدہ سناٹا تھا

ایک طرف بچپن کاڑھے بیٹھی تھیں راتیں

ایک طرف پر شور دنوں کا میلا تھا

ٹوٹے پھوٹے چند کھلونوں کے ہمراہ

اک گوشے میں اس کا بچپن رکھا تھا

ہر شوخی پر ہر معصوم شرارت پر

ماں کے پاکیزہ آنچل کا سایہ تھا

کتنے آنچل اس کے لئے لہرائے تھے

کتنے رخوں نے اس پہ کرم فرمایا تھا

کیسے کیسے دوست سجیلے بانکے تھے

کیا کیا ان کے ساتھ میں گھومنا پھرنا تھا

پھر ماں کے اصرار پہ اک دن رات ڈھلے

اس کے شبستاں میں کوئی در آیا تھا

اس کو بوڑھا ہوتے دیکھ کے بھاگ گیا

اس کے اندر چھپا ہوا جو لڑکا تھا

*****

دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

ہمیں یوسف کا سفر یاد آیا

میں نے تلوار پہ سر رکھا تھا

یعنی تلوار سے سر یاد آیا

وہ تری کم سخنی تھی کہ مجھے

بات کرنے کا ہنر یاد آیا

اے زمانے مرے پہلو میں ٹھہر

پھر سلامِ پسِ دریاد آیا

کسے اڑتے ہوئے دیکھا کہ تمہیں

اپنا ٹوٹا ہوا پر یاد آیا

آج میں خود سے ملا ہوں طالب

آج بھولا ہوا گھر یاد آیا

*****

محسنوں کی آنکھ سے کاجل چرا لیتے ہیں لوگ

سوچتے کیا ہو، نظر رکھا کرو سامان پر

*****

وہ اپنے جھاگ کو متھنے لگا ہے

نہ جانے کیا بنائے گا سمندر

*****

کس نام کے طلسم میں گم ہو گئے وہ لوگ

یعنی وہ لوگ بھول گئے اپنا نام تک

دیوار گر رہی ہے ہمارے مکان کی

پہنچاؤ بات خضر علیہ السلام تک

*****

بام و در پر ہجوم کرتی شام

ایک آسیب ہے گزرتی شام

*****

مرے بچو! مجھے آواز دی ہے روحِ صحرا نے

سو اب گھر سے چلے جانے کی آسانی مجھے دے دو

*****

خلوتِ جاں میں چیخ رہا ہوں کوئی نئی عریانی دے

جیسے دشت میں پیاسا چیخے میرے مولا پانی دے

یادوں کا ویران جزیرہ برسوں تک آباد رہے

ہجر کا موسم اچھا گزرے ایسی کوئی نشانی دے

رات سے پہلے گھر آ جانا دُھند اُترنے والی ہے

رات کہاں سے خوشیاں دے گی شام ہی جب ویرانی دے

*****

حبس میں یوں ہوا چلی دل کا فراغ لے گئی

شہر سے امن لے گئی گھر سے چراغ لے گئی

پھر سرِ شاخِ مصلحت اُس کے لبوں کی فاختہ

امن کے جھوٹ دے گئی جنگ کے داغ لے گئی

*****

یہ بستی اتنی پر اسرار کیوں ہے

یہاں چاروں طرف دیوار کیوں ہے

*****

کون جیت سکتا ہے عزمِ چرخ پیما سے

سانپ ہار جاتے ہیں چوبِ خشکِ صحرا سے

لے کے ہاتھ میں پانی پھینکنا بتاتا ہے

تشنگی نچوڑی ہے اس نے موجِ دریا سے

چاکِ پیرہن تسلیم، ہم پہ یہ کرم کیسا

ہم کہاں کے یوسف ہیں، پوچھنا زلیخا سے

ہم سے خوش نگاہی کی بھیک لینے آئے ہیں

دستِ گل فروشاں پر یہ دھرے ہوئے کاسے

*****

ماہی گیر اکیلا تھا، لوٹ کے کیسے گھر آتا؟

ناؤ کے چپو ٹوٹے تھے اور سمندر گہرا تھا

*****

ہم آج آ بیٹھے ہیں تیرے در پر، سو ہم سے مل لے

کہ ہم قلندر ہیں، کیا بھروسہ قلندروں کا

*****

اس سال کے سیلاب سے سارے کگارے کٹ گئے

دریا کے پیچ وتاب کا ساحل کو اندازہ نہ تھا

*****

جیسے ہی زینہ بولا تہہ خانے کا

کنڈلی مار کے بیٹھا سانپ خزانے کا

بات کہی اور کہہ کر خود ہی کاٹ بھی دی

یہ بھی اک پیرایہ تھا سمجھانے کا

*****

جسم نے اپنی عمر گزاری سندھ کے ریگستانوں میں

دل کم بخت بڑا ضدی تھا، آخر تک پنجاب رہا

*****

مجھ کو مل پایا نہ کیوں اپنی ہی ہستی کا سراغ

آگہی میری چراغِ دستِ نابینا ہے کیا

*****

کبھی عتابِ بزرگاں کے خوف سے پیدا

گلی کے موڑ پہ بے وجہ تیز رفتاری

*****

یہ مرا مشکیزۂ بے آب، صحرا اور میں

جانتے ہیں پیاس کے آداب صحرا اور میں

یہ تو میں بھی جانتا ہوں، جس کا جو مقسوم ہے
ہو ہی جائے گا کبھی شاداب صحرا، اور میں ؟

*****

غاروں کی دیواروں پر یہ تصویروں کا جال
بوڑھا ماضی ہانپ رہا ہے سرد گھپاؤں میں

*****

لفظوں کے گستاخ سفینے
سطحِ زباں پر ڈول رہے ہیں

جس مٹکے سے پیاس بجھائی
اس میں مٹی گھول رہے ہیں

*****

چاروں اور تھی جھوٹ کی برکھا سانچ کی آنچ ہمیں تک تھی
ہم بیساکھ کی دھوپ سے سلگے ساون کی ہریالی میں

*****

کہاں تک فلسفہ الفاظ کے آسیب سے بچتا
معانی ذہن کے اندر بھی حرف آلودہ ہوتے ہیں

*****

کسی پیڑ کے سائے میں دھونی رما، کسی گھر میں نہ بن مہمان میاں
کوئی مکھڑا کھب گیا دل میں اگر، اسی ڈنک سے جائے گی جان میاں

نہ میں وارث شاہ نہ میر تقی، کشکول بدست گدا گر ہوں
کچھ ادھر سے لیا کچھ اُدھر سے لیا، یوں ہی جمع کیا دیوان میاں

*****

کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگار کے پیچھے
کہ یہ ہنگامۂ تخلیق بے علت نہیں برپا

*****

دور افتادہ قصبے میں طالب ہم آباد ہوئے
ڈرے ہوئے تھے تہذیبوں سے، ڈسے ہوئے آگاہی کے

*****

ماضی کے ہر دور میں دنیا والوں کا دستور رہا
پیغمبر سے بیر نکالا، نفرت تھی پیغام کے ساتھ

کس لکڑی کا ماضی کیا تھا جلتا چولہا کیا جانے
اس سے پوچھو جس کا ربط ہو باغ کے قتلِ عام کے ساتھ

ترک و طلب کا ہم دونوں میں کب سے تصادم جاری ہے
اس کا نام لیا جاتا ہے اب تک میرے نام کے ساتھ

*****

بے مقصد پرواز سے تھک کر تتلی پھول پہ بیٹھ گئی
پھول تو اپنی جان سے ہارا تتلی بھی بدنام ہوئی

کوفے کے سارے دروازے آخر مجھ پر بند رہے
خوف زدہ گلیوں میں تنہا پھرتے پھرتے شام ہوئی

گاؤں کے پس منظر میں دن بھر چیخنے والی پن چکی
میرے کل کی خاطر اپنے آج میں بے آرام ہوئی

*****

کتنی بے آواز ہے دن میں نیستاں کی فضا
شب کی تاریکی میں لیکن کتنی پر اسرار تھی

*****

شام ڈھلے منہ ڈھانپ کے سونا سورج کی مجبوری ہے
اپنی خوشی سے کون یہ چاہے اجلے دن کو رات کرے

*****

خلوتِ بے نشان میں پھول کھلے نشان کے
وحشتِ دل بھی سو گئی چادرِ ماہ تان کے

اپنے لباسِ جاں پہ بھی صاحبو ٹک نظر کرو
ہنستے رہو گے کب تلک ہم کو غریب جان کے

خلوتیانِ کنجِ ہوش تشنہ لبانِ یم بہ دوش
میرے حریف تھے مگر لوگ تھے آن بان کے

موج بہ موج یم بہ یم بادِ مراد ساتھ تھی
ناؤ سے رد نہ ہو سکے فیصلے بادبان کے

تیری گلی میں جاگ کر ہم نے بھی جُگ بتائے ہیں
ہم پہ بھی فاش ہوں کبھی رنگ ترے مکان کے

کیا وہ نگاہِ رنگ و بو گاؤں سے کوچ کر گئی
گنگ ہے نیم کا درخت خشک ہیں کھیت دھان کے

*****

لوگ اس طرح سے ملتے ہیں سرِ کوچۂ رزق
بڑھ کے تلوار سے جیسے کوئی تلوار ملے

*****

وہ مجھ پہ فاش ہوا کل کھلی کتاب کی طرح
اس اتفاق کو ذوقِ مطالعہ کہیئے

*****

دل کسی منزل کو پالینے کی خواہش کیا کرے
کھیت ہی جب کم زراعت ہوں تو بارش کیا کرے

*****

سنا کے قید میں احوال راہگیروں کے
ہوا نے کھول دئے دست و پا اسیروں کے

کوئی سخی نظر آتا تو ہاتھ پھیلاتے
اس انتظار میں دن کٹ گئے فقیروں کے

*****

ایک کنویں کی گہرائی سے مصر کے تختِ شاہی تک
دیکھنے والی آنکھ کو کتنے نادیدہ بازار ملے

*****

وقت نے میری ہی محنت سے اپنی ساکھ بنائی ورنہ
اس کا اتنا نرخ کہاں تھا پہیے کی ایجاد سے پہلے

*****

وقت کی پگڈنڈیوں سے بستیوں تک آ گئے
ہم ابھی کچھ قرن پہلے تک چراگاہوں میں تھے

*****

رموزِ فطرت کا داستاں گو شکار ہے کم بضاعتی کا
نئی کہانی میں ٹانکتا ہے پرانے ٹکڑے کہانیوں کے

*****

آج بھی آپ گئے ملنے اس کے گھر، پھر کل جائیں گے
طالب صاحب آگ سے مت کھیلیں، بالآخر جل جائیں گے

وہ اپنے گھر کی رونق بن جائے تو ہم وعدہ کرتے ہیں
اپنے گھر واپس جا کر گھر کے ماحول میں ڈھل جائیں گے

رسی جل گئی لیکن اس کے بل شعلوں پر خندہ زن ہیں
جب خاکستر بن کے اڑے گی تب رسی کے بل جائیں گے

حدِ نظارہ تک خشخاش کے نیلے پودے تھے اور میں تھا
دل نے کہا تھا آنکھ جھکا لے ورنہ پودے جل جائیں گے

ذہن کے سب کھڑکی دروازے کھول کے اندر جھاڑ دے دو
کب سے حجرہ بند پڑا ہے اس میں بچھو پل جائیں گے

اُس نے مجھ سے عذر تراشے یعنی وہ یہ جان رہا تھا
ایک یہی دوکان ہے جس پر کھوٹے سکے چل جائیں گے

*****

ایک ہی کہانی ہے قصہ گو کے کیسہ میں
قصہ گو کے لہجوں سے رخ بدلتا جاتا ہے

کانچ کے کھلونوں پر اعتبار کیا کرنا
وہ بھی ٹوٹ جاتے ہیں جو خدا بناتا ہے

*****

دھوپ جب تک سر پہ تھی زیرِ قدم پائے گئے
ڈوبتے سورج میں کتنی دور تک سائے گئے

آج بھی حرفِ تسلی ہے شکستِ دل پہ طنز
کتنے جملے ہیں جو ہر موقع پہ دُہرائے گئے

آج سے میں اپنے ہر اقدام میں آزاد ہوں
جھانکتے تھے جو مرے گھر میں وہ ہمسائے گئے

*****

دیارِ حسن میں تجدیدِ عاشقی کے لئے
ہم ایسے لوگ ضروری ہیں ہر صدی کے لئے

کنارِ نہر بنفشے کی جھاڑیوں کے قریب
وہ سوگوار کھڑی تھی اک اجنبی کے لئے

*****

اس کی خوشی سے بزم میں آنا اس کی خوشی اٹھ کر جانا
دونوں عمل ہیں غیر ارادی، پیدا ہونا مر جانا

ڈول کنویں میں ڈال کے پانی کھینچنے والے پردیسی
پیاس بجھا کر بیٹھ نہ جانا گاؤں سے ہجرت کر جانا

رات بھری محفل میں طالب ایک ہی دکھ تھا دونوں کا
اس کو اپنے گھر جانا تھا مجھ کو اپنے گھر جانا

*****

بستی بستی گھوم رہا ہوں اب بھی وہی درخواست لئے
وہ درخواست جو ہر دفتر میں یکساں نامنظور ہوئی

عطر فروشوں کے کوچے میں ایک شناسا خوشبو نے
میرا دامن تھام لیا تھا اتنی دیر ضرور ہوئی

*****

جس چھتے کو توڑ رہے ہو اس میں شہد کی مکھی نے
صحرا صحرا جنگل جنگل پھر کر شہد بنایا ہے

کل تک اس نے وہم کہا تھا خوابوں کی ماہیت کو
آج وہ مجھ سے خوابوں کی تعبیریں پوچھنے آیا ہے

دھوپ اتری تھی آنگن میں اور دیواروں پر سایا تھا
دھوپ چڑھی ہے دیواروں پر اور آنگن میں سایا ہے

*****

چاندنی میں اداسیاں کیوں ہیں
دھوپ میں یہ غبار سا کیا ہے

بات کو لوگ کیوں سمجھتے ہیں
لفظ و معنی میں رابطہ کیا ہے

*****

میں نے ہر در پہ جا کے دستک دی
میں نے ایقاں کو وسعتِ شک دی

*****